پروفیسر مقبول بیگ بدخشانی

ضیاء الدین برنی اور اس کا نظریۂ سیاست

ماہ جولائی کے المعارف میں ضیاء الدین برنی کے تعارف کے لیے اس کے مختصر حالات زندگی پیش کیے گئے تھے۔ زیر نظر مضمون اس کے سیاسی نظریات پر مشتمل ہے۔ اس مقالے کی ترتیب میں میرے سامنے فتاویٰ جہانداری کا مخطوطہ ہے جو اس کے سیاسی نظریات کا حامل ہے۔

کتاب فتاویٰ جہانداری فیروز شاہ تغلق کے عہد کے پہلے چھ سالوں کے دوران لکھی گئی۔ اس میں برنی نے غیاث الدین بلبن (۶۶۴ تا ۶۸۶ھ مطابق ۱۲۶۶ تا ۱۲۸۷ء)، معز الدین کیقباد (۶۸۶ تا ۶۸۹ھ مطابق ۱۲۸۷ تا ۱۲۹۰ء)، جلال الدین خلجی (۶۸۹ تا ۶۹۵ھ مطابق ۱۲۹۰ تا ۱۲۹۶ء)، علاء الدین خلجی (۶۹۵ تا ۷۱۵ھ مطابق ۱۲۹۶ تا ۱۳۱۶ء)، قطب الدین مبارک شاہ خلجی (۷۱۶ تا ۷۲۰ھ مطابق ۱۳۱۶ تا ۱۳۲۱ء)، سلطان غیاث الدین تغلق (۷۲۰ تا ۷۲۵ھ مطابق ۱۳۲۱ تا ۱۳۲۵ء)، سلطان محمد بن تغلق (۷۲۵ تا ۷۵۲ھ مطابق ۱۳۲۵ تا ۱۳۵۱ء)، اور فیروز شاہ تغلق کے ابتدائی چھ سالوں (۷۵۲ تا ۷۵۸ھ مطابق ۱۳۵۱ تا ۱۳۵۷ء) کے سیاسی اور معاشرتی حالات کے پیش نظر اپنے نظریات پیش کیے۔ اس میں برنی نے ملکی سیاست

فتاویٰ جہانداری کا اصل مخطوطہ کامن ویلتھ لائبریری میں موجود ہے۔ ہمیں اس کا عکسی نسخہ ڈاکٹر افسر سلیم صاحب صدر شعبہ سیاسیات دانش گاہ پشاور کی وساطت سے میسر آیا ہے۔ بظاہر یہ مخطوطہ منفرد معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس کا ذکر نہ برٹش میوزیم کے مخطوطات کی فہرست میں آیا ہے۔ نہ انڈیا آفس لائبریری کی کیٹیلاگ میں اور نہ سی۔ اے سٹوری کی کتاب پرشین لٹریچر میں۔ عکسی نسخہ ۲۴۹ فولیوز (اوراق) یعنی ۴۹۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے ہر ورق میں ۱۵ سطور اور ہر سطر میں تقریباً ۱۲ الفاظ ہیں۔ خط شکستہ ہے۔ بعض سطور کے الفاظ اڑے ہوئے ہیں۔

کے ساتھ ساتھ معاشرے کا بھی جائزہ لیا ہے جس میں بادشاہ، مشیران، وزرا، امرا، علما و مشائخ، عوام، تجار، زراعت پیشہ اور صنعت کار وغیرہ شامل ہیں۔

برنی ذاتی طور پر سیاست کو مذہب سے الگ نہیں سمجھتا بلکہ اس کی دلی خواہش تھی کہ ملکی، سیاسی اور معاشی مسائل کے حل کرنے میں قدیم ضابطہ حیات کی طرف رجوع کیا جائے۔ اس لیے اس نے کلام مجید، حضرت نبی کریمؐ کے ارشادات اور خلفائے راشدین کے احکام کی روشنی میں بعض مسائل کو واضح کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ نیز بعض قدیم پرشکوہ بادشاہوں اور دانشوروں کے حوالے سے بھی کچھ بیانات درج کیے۔ سلطان محمود غزنوی کو اس نے خاص طور سے مثالی رہنما بنایا ہے جو دیندار، نیک کردار، خوش خصال، علم پرور ہونے کے ساتھ ساتھ شجاعت اور دیانت کا بھی مظہر تھا۔ کسی محبوب رہنما کے ذریعے اپنے مافی الضمیر کو بیان کرنے کا انداز قدیم علما نے اختیار کیا تھا۔ برنی نے بھی یہ انداز اپنایا۔ سلطان محمود کو وفات پائے کافی عرصہ ہو چکا تھا لیکن اس کے سیاسی شعور اور مذہبی شیفتگی کی یاد برنی کو نہیں بھولی چنانچہ اکثر وہ سلطان محمود کے احکام و ضوابط کو بطور مثال پیش کرتا ہے۔ اس کے علاوہ سیاسی حالات پر اپنے ذاتی تاثرات کو بھی وہ سلطان ہی کی زبانی بیان کرتا ہے۔ کچھ اس طرح کہ یہ مثالی رہنما اپنے تجربات کی روشنی میں اپنے بیٹوں اور شاہان اسلام کو نصیحت کرتا دکھائی دیتا ہے۔ اس انداز خطاب میں کچھ برنی کی عقیدت کو بھی دخل ہے جو اسے سلطان کے دینی شغف کی وجہ سے اس کے ساتھ تھی اور شاید اس طرح وہ اپنے بیانات کو ہمہ گیر اور مؤثر بھی بنانا چاہتا ہے۔ ممکن ہے یہ خیال بھی اس کے پیش نظر ہو کہ کوئی سخن گستاخانہ بات زبان قلم سے نکل جائے تو اس کی ذمے داری خود اس پر نہ آئے اور وہ سزا و تعقیب سے بچا رہے۔

برنی کے بعض اہم نظریات ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں۔

بادشاہ کو خدا کی حفاظت حاصل ہوتی ہے

اس سلسلے میں ضیاء الدین لکھتا ہے کہ بادشاہ جب ملکی مصالح کے لیے قدم اٹھاتا ہے تو خداوند تعالیٰ کی پناہ اور کلام خداوندی کی برکات کا متمنی ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ کی درگاہ بے نیاز میں التجا کرتا ہے۔ حق تعالیٰ اس کی حفاظت کرتا ہے اور اسے شیطانی وسوسوں اور فاسد خیالات سے محفوظ و مصئون رکھتا ہے۔

اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنے کے ساتھ ساتھ بادشاہ کو اپنی ذاتی حفاظت کے لیے بھی عملی قدم اٹھانے چاہئیں کیونکہ دنیا میں بہت سے فتنہ پسند لوگ ہیں جو ہوائے نفس، شدت ہوس اور شر ذاتی کے غلبے کی وجہ سے ہر قسم کے نتائج سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ بدسرشتی ان کی عقل پر پردہ ڈال دیتی ہے اور وہ حرص و ہوس کی جلتی ہوئی آگ میں کود پڑتے ہیں اور اس خطرے کو خاطر میں نہیں لاتے کہ ان کے سر شاخوں کی طرح کاٹ دیے جائیں گے۔ کچھ ایسے شر پسند لوگ بھی ہوتے ہیں جنھیں بعض وجوہ کی بنا پر بادشاہ سے ذاتی رنجش ہوتی ہے اور وہ بادشاہ سے انتقام لینے کے درپے رہتے ہیں۔

پس بادشاہ عاقل آں بود کہ از مکر و غدر حاسداں و شریراں ایمن نباشد و جہاندارانِ سلف و خلف از بی باکی ماکراں و شریراں و بدنفس خود را بنزغاکیاں و پاسباناں بر ویمان داشتہ اند۔

پس عاقل بادشاہ وہ ہوتا ہے جو شریر، بدنفس اور فتنہ پرداز لوگوں کی ریشہ دوانیوں سے غافل نہ ہو۔ زمانہ سلف اور عصر حاضر کے بادشاہ ہمیشہ باغیوں، فتنہ پردازوں اور بدباطنوں کے شر سے محفوظ رہنے کے لیے محافظوں اور نگرانوں کا معقول اور مؤثر نظام قائم کرتے ہیں۔

بادشاہ کے مرتبۂ دینی کی تعیین

بادشاہ اور اس کی حکمت عملی کا جب ذکر آتا ہے تو برنی عموماً اسے مذہب کے پس منظر میں دیکھتا ہے اور اپنے تاثرات کو سلطان محمود کے بیان کے ذریعے پیش کرتا ہے:

اے فرزندانِ محمود! تمھیں اس بات کا یقین ہونا چاہیے کہ سیاسی اور انتظامی امور میں مسلمان بادشاہ کی کامیابی اور ناکامی کا انحصار اس کے مذہبی عقائد کی استواری اور نااستواری پر ہوتا ہے۔ اگر بادشاہ کا ایمان پختہ ہے اور الہامی کتابوں کے ذریعے پیغمبران کبار نے جو تعلیمات دی ہیں ان کے صحیح اور سچا ہونے پر اسے کامل یقین ہے تو یہ اس کے سچے مذہب اور ایمان راسخ کی بنیاد ہے اس صورت میں بادشاہ اپنے سیاسی منصوبوں میں کامیاب ہوگا اور عوام کی خواہشات بھی عنایت ربانی سے پوری ہوں گی۔

بادشاہ کے دینی مسلک کے متعلق برنی یہاں تک بھی کہتا ہے کہ اگر بادشاہ کا مذہب میں اعتقاد پختہ ہے لیکن وہ بہت زیادہ زہد و عبادت میں مشغول نہیں رہ سکتا تو اس میں مضائقہ نہیں۔ وہ

اگر مذہب میں پختہ یقین رکھنے کے باوجود تقاضائے بشریت کے مطابق تفریحات میں حصہ لیتا ہے تو وہ قابل معافی ہے۔

ہرگاہ بادشاہ را اعتقاد در دین سید المرسلینؐ راسخ و ثابت بود کہ اگر در طاعات و عبادات زیادتی و صیام نوافل و تطوعات مستحب از روزہ و نماز نرسد، باکی نبود۔

بادشاہ اگر دین اسلام کا محافظ ہے اور اشاعتِ دین میں کوشاں ہے تو اس کی فروگذاشتیں محو ہو جاتی ہیں۔

مع ذلک کہ اگر در اعتقاد بادشاہ خللی و زللی نبود، عیش و عشرت و ماثمی کہ او را از قبیل نفسانی افتد و بہ برکت رسوخ اعتقاد او مکفر نشود۔ و بدانچہ او دین پناہی و دین پروری میکند، از نامۂ اعمال او سیئات و خطیات نفسانی او را محو می کنند۔

بادشاہ کے راسخ الایمان ہونے کی علامت یہ ہے کہ وہ احکام شریعت پر خود بھی چلے اور رعایا کو بھی چلائے۔ اپنی شوکت اور سطوت شاہانہ سے احکام شریعت کا احترام لوگوں کے دلوں میں اس طرح پیدا کرے اور اوامر و نواہی کی پاس داری اس حد تک کرے کہ اس کے ملک میں شریعت کی خلاف ورزی کرنے والے کسی فرد سے کوئی شخص کھلم کھلا یا پوشیدہ طور پر میل جول نہ رکھے۔ محافظِ ایمان بادشاہ کی توصیف بیان سے بالا ہے کیونکہ اس کی دین پناہی اور دین پروری کی بدولت مومن فراغ خاطر سے طاعت و عبادت میں مشغول رہتے، احکام شریعت کی پیروی کرتے اور اہل اسلام اور ذمی حفظ و امان پاتے ہیں۔

سلطنت کی حکمت عملی بادشاہ کی ذاتی زندگی کا آئینہ ہوتی ہے۔ اس لیے بادشاہوں پر لازم آتا ہے کہ ان قوانین سے جو وہ دوسروں کے لیے نافذ کرتے ہیں خود بھی انحراف نہ کریں۔ علمائے سلف نے بالوضاحت بادشاہوں کے حسن اعتقاد کے بارے میں مذکورہ ذیل علامتیں بتائی ہیں:

پہلی یہ کہ وہ دار الحکومت، شہروں، قصبوں اور صوبوں میں اخلاق کا محاسبہ کرنے والے سخت کوش محتسب اور امیران داد مقرر کرے، اور اپنی تائید و حمایت سے اُن کی قوت و شوکت میں اضافہ کرے تاکہ وہ اہل اسلام کو اوامر و نواہی کا احساس دلائیں۔ مے خواروں، قمار بازوں، اور طوائفوں کو مناسب سزاؤں کے ذریعے جرائم سے باز رکھیں۔ اگرچہ تنبیہ و تہدید اور تحقیر و

تذلیل کے باوجود راہِ راست پر نہیں آتے، اور ایمان و اسلام کا دعویٰ کرنے کے باوجود معاصی سے اپنا دامن نہیں بچاتے تو جو لوگ ان میں سے امیر ہیں ان کی املاک ضبط کر لیں اور جو غریب ہیں انھیں قید و بند کی سزائیں دیں۔ شراب کا کاروبار کرنے والوں کو شہر بدر کر دیں تاکہ وہ کسی گوشے میں جا کر سکونت اختیار کر لیں۔ اگر شراب کا دھندا کرنے والے مسلمان ہوں تو انھیں شدید سزائیں دیں تاکہ کسی مسلمان کو ایسا کاروبار کرنے کی مجال نہ ہو سکے۔ عورتوں کے سے طور طریقے اختیار کرنے والے مخنثوں کو زد و کوب کریں اور سخت سلوک روا رکھیں تاکہ وہ شہر کو چھوڑ جائیں اور دیہات میں جا کر کھیتی باڑی سے یا کسی اور جائز وسیلے سے معاش پیدا کریں۔ شہروں اور قصبوں میں بد اخلاقی کو روکیں۔ طرب آباد یعنی موسیقی خانوں کی تعمیر کی ممانعت کریں اگر ایسے مقامات تعمیر کیے گئے ہیں تو انھیں منہدم کرا دیں۔

سنت رسول اللہ میں حائل ہونے والی بدعات کو روکیں۔ مسلمانوں کو تلقین کریں کہ محلہ بہ محلہ، کوچہ بہ کوچہ، قریہ بہ قریہ اور خانہ بخانہ جا کر اسلام کے پانچ بنیادی ارکان پر عمل کرنے کی تبلیغ کریں۔ جو مسلمان باقاعدگی سے نماز ادا نہیں کرتے انھیں مختلف طریقوں سے فہمائش کریں اور تارکان نماز کو سختی سے مجبور کریں کہ یہ فریضہ ادا کریں۔ امرا کو کہا جائے کہ وہ زکوٰۃ ادا کریں۔ اس سلسلے میں کسی بہانے کو درخور قبول نہ سمجھیں۔ جو لوگ رمضان المبارک کے مہینے میں کھلم کھلا کھاتے پیتے ہیں، جرم کا ارتکاب کرتے ہیں اور حیائے اسلام اور خوف بادشاہ کو خاطر میں نہیں لاتے انھیں محبوس کر کے بادشاہ کے حضور پیش کریں تاکہ وہ اس بے توفیق گروہ کو اپنی صوابدید کے مطابق قید و بند، جلا وطنی، یا قتل کی سزا دے جس سے عوام کو تنبیہہ ہو۔ نیز ارشاداتِ ربانی کا بول بالا کرنے، شعائر اسلام کا احترام سکھانے اور اسلام کی سچائی پر کاربند رہنے کے لیے دین اسلام کے مزاحموں پر قابو رکھیں۔ مسلمانوں کو جادۂ اسلام پر گامزن رہنے اور غیر مسلم موحدین کو خود اپنی مذہبی حدود پر قائم رہنے کی تلقین کریں۔

جہاد کے متعلق برنی بہت واضح الفاظ میں لکھتا ہے کہ جنگوں میں مسلمان بادشاہوں کے دلوں میں دو خواہشیں ہونی چاہئیں کہ دشمن پر فتح حاصل کریں یا میدان جنگ میں شہادت کا مرتبہ حاصل کریں۔

مشورہ کی اہمیت

برنی نے بادشاہت کا تجزیہ اسلامی نقطہ نظر سے کیا ہے اور واضح طور پر کہا ہے کہ سلاطین دہلی کی

حکومت کو اسلامی نہیں کہا جا سکتا۔ بادشاہوں کے قوانین قرآنی ارشادات، پیغمبر اسلام کے فرمودات اور خلفائے راشدین کے ضوابط سے متجاوز ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی وقت کی رفتار پر بھی اس کی نظر ہے۔ اس کا خیال ہے کہ وقت کے تقاضے بدلتے رہتے ہیں۔ آج معاشرہ وہ نہیں جو کئی سو برس پہلے تھا۔ لوگوں کی ضرورتیں ہر آئے دن بدلتی اور بڑھتی ہیں اور پھر مختلف مذاہب کے اعتقادات کا فرق بھی اپنی جگہ پر موجود ہے اس لیے معاشرے کے بعض مسائل پر تقاضائے وقت کے مطابق غور کرنا پڑتا ہے۔ اس کے لیے مجلس مشاورت کا ہونا اشد ضروری ہے۔

حکومت کا کاروبار درست طور پر چلانے کے لیے مشاورت کی ہمیشہ سے ضرورت محسوس کی جاتی رہی ہے۔ ظہور اسلام سے اس کی اہمیت اور بھی بڑھی۔ رسول کریمؐ اہم معاملات میں اپنے صحابیوں سے مشورہ فرمایا کرتے تھے اور مشیر بڑی آزادی سے اپنی رائے دیا کرتے تھے۔ برنی لکھتا ہے:

سلطان محمود فرماید: ای فرزندان محمود! بدانید کہ بہتر و مہتر ہمہ آفریدگان، پیغمبرانند، و مہتر و بہتر ہمہ پیغمبران، پیغمبر ماست علیہ السلام۔ باچنداں جلالت کمال عقل و تواتر وحی در باب مشورت فرمانی نازل می شود کہ وشاورھم فی الامر۔[۵۴]

کلام الٰہی سے مشاورت کی اہمیت واضح ہے۔ حضرت عمرؓ بارگاہ ایزدی میں شکر بجا لاتے ہیں کہ انھیں بزرگ ترین صحابہ کی مشاورت حاصل ہے اور ان کے مشوروں سے ملک و ملت کی مصلحتوں کی دیکھ بھال ہوتی ہے۔

امیر المومنین عمرؓ بار ہا بر سر منبر گفتی کہ من بکدام زبان توانم کہ باری تعالیٰ را شکر گویم کہ مرا بر ملک مصطفیٰؐ حاکم گردانید و چندین بزرگان صحابہ را، کہ ہر یک چو انبیاء بنی اسرائیل و بکمال علم و عقل ~~آراستہ~~ وا زمیا من صحبت رسول رب العالمین دل ہای ایشاں مہبط الہامات خیر گشتہ، از رای دولت من و رای زنان امور خلافت می ساخت و مرا توفیق داد کہ بتوافق آرای ایشاں، مصالح دین و دولت مصطفیٰؐ بپرداخت رسانم و ایشانم را بر من شفقت و مہربانی داد، "تا ہر اندیشہ کہ در صلاح جہانیانی در خاطر ایشاں گذشت، از من مخفی نداشتند۔[۵۵]

رسول اکرمؐ پر وحی نازل ہوتی تھی اور از روئے وحی آنحضرتؐ مشاورت کی تلقین فرماتے تھے۔ خلفائے راشدین نے مشاورت کو اپنے لیے نہ صرف ضروری سمجھا، بلکہ سعادت کا موجب بھی خیال کیا۔

پس بر آنکہ وحی نازل نشود و عقول ایشاں آمیختۂ ہوا باشد و در الہام از تاریکی شہوی معاصی التباس افتد، ایشاں را بی مشورت مخلصان دانا ورای زدن و دولت خواہان صاحب تجربہ پرداخت مصالح جہانداری و جہانبانی چگونہ میسر شود۔

یعنی بادشاہ، جن پر وحی نازل نہیں ہوتی اور جن کی عقل و دانش میں ہوا و ہوس کو بھی دخل ہو سکتا ہے، مخلص دانش وروں اور تجربہ کار دولت خواہوں کے مشورے کے بغیر حکومت کی مصلحتوں کی نگہبانی کیسے کر سکتے ہیں۔

۳۔ بادشاہ کے مشیر کیسے ہونے چاہئیں

برنی نے مشیروں کے لیے جو اوصاف پیش کیے وہ ہر زمانے کے لیے ضروری ہیں۔ ان کا مختصراً ذکر درج ذیل ہے:

۱۔ مشیران سلطنت مجلس مشاورت میں شامل ہوں تو آزادانہ، بلامد و رعایت رائے دیں کوئی خوف یا اندیشہ ان کی رائے پر اثر انداز نہ ہو۔ اپنی رائے کی حمایت میں دلائل پیش کریں اور آزادانہ ماحول میں تبادلہ خیالات کریں۔ جب وہ کسی ایک رائے پر متفق ہو جائیں تو اسے بروئے کار لانے کی کوشش کریں۔

۲۔ مشیر مستقل طور پر مقرر کیے جائیں۔ سب مشیر خلوص اور تجربہ میں یکساں ہوں اور درجہ سب کا ایک سا ہونا چاہیے۔ اگر تجربہ سب کا یکساں نہ ہو اور درجوں میں تفاوت ہو تو رائے زنی میں شتر و گربہ کی مثال صادق آئے گی۔

۳۔ سب مشیر رموز سلطنت سے آگاہ ہوں۔ اگر وہ رموز سلطنت سے آگاہ نہ ہوں گے تو فلاح ملکی کی طرف ان کا خیال نہ جا سکے گا۔ جس طرح ایک معالج ہے کہ جب تک وہ مریض کے مزاج، عادات اور دیگر کیفیات سے واقف نہ ہوگا اس کا علاج مؤثر نہیں ہوگا۔

۴۔ اس امر کے باوجود کہ مشیروں کو بادشاہ نامزد کرتا ہے اور وہ اس کے قریب بھی ہوتے ہیں، انھیں ملازمت اور زندگی کی بقا کی علی ضمانت حاصل ہونی چاہیے تاکہ مجلس مشاورت میں انھیں خوشامد اور کاسہ لیسی کا خیال نہ آئے اور کھلم کھلا ما فی الضمیر کا اظہار کر سکیں۔ انھیں یقین ہونا چاہیے کہ آزادانہ رائے کی قدر کی جائے گی اور ان کی وفاداری کا مظہر سمجھی جائے گی۔ انھیں بادشاہ کی

برہمی مزاج سے ہراساں نہ ہونا چاہیے۔

۵۔ بادشاہ کے لیے مناسب ہے کہ اپنی رائے کو مخفی رکھے اور مجلس کی آرا سے آگاہی حاصل کرے آرا کی حمایت میں وہ جو دلائل پیش کریں، انھیں بغور سنے، اور ان کی توافق رائے کا منتظر رہے۔ اگر بادشاہ مجلس میں اپنی رائے پہلے پیش کر دے گا تو مشیر طوعاً وکرہاً بادشاہ وقت کی رائے کی تعریف و توصیف کریں گے اور اپنی رائے ظاہر نہیں کر پائیں گے۔ بادشاہ کی رائے سے کسی کو اختلاف کرنے یا اس کے خلاف دلائل پیش کرنے کا یارا نہ ہوگا۔ تجربے سے اکثر ایسا ہی ظاہر ہوا ہے۔

۶۔ امور سلطنت کے متعلق بحث و تمحیص کے لیے موزوں ترین وقت مقرر ہونا چاہیے یعنی خورونوش سے پہلے۔ بعض بادشاہ امور سلطنت پر بحث کرنے کے دوران روزے سے ہوتے اور مشیروں کو بھی روزہ رکھنے کی تلقین کرتے تاکہ بادشاہ اور مشیروں کے دلوں پر متنازعہ فیہ امر کا درست پہلو واضح ہو جائے۔ وہ اولیا کی زیارت کو بھی جاتے اور صدقہ و خیرات دے کر خدا کے حضور رہنمائی کے لیے دعا کرتے تھے۔ مشورے کو وہ محض "نشستند و گفتند و برخاستند" ہی نہ سمجھتے تھے بلکہ اسے ملکی نظم و ضبط کی روح رواں سمجھتے تھے۔

۷۔ اگر مشیر اپنے خیال میں کوئی بے لاگ فیصلہ دیں لیکن اس میں ہوا و ہوس کا دخل ممکن ہو، تو مسئلے پر نظر ثانی کر لی جائے اور توافق رائے میں احتیاط ضروری سمجھی جائے۔

برنی نے اس سلسلے میں بار بار تنبیہہ کی ہے کہ جس فیصلے میں کسی مصلحت یا ہوا و ہوس کو دخل ہوگا وہ فیصلہ مستحسن نہ ہوگا۔

سلاطین عموماً ملکی مسائل میں مشیروں سے صلاح مشورہ کیا کرتے تھے اور احکام شریعت کے لیے مذہبی علما سے بھی رجوع کرتے تھے۔ علاء الدین کے عہد کے مشہور قاضی مغیث الدین تھے۔ انھیں دربار میں بلا کر سلطان نے جہاں اور مسائل میں احکام شریعت سے رہنمائی چاہی وہاں یہ بھی دریافت کیا کہ یہ کثیر مال و دولت جو میں دیوگیر سے بطور غنیمت لایا ہوں۔ یہ میرا ہے یا بیت المال کا۔ مغیث الدین بولے:

آں مالی کہ خداوند عالم از دیوگیر آوردہ است بہ قوت لشکر اسلام آوردہ است و مالی کہ بقوت لشکر اسلام آوند، آں مال بیت المال مسلمانان باشد کہ اگر خداوند عالم تنہا مالی از جای

حاصل کردی و آنرا وجہی مباح در شرع بودی، آں مال از آن خداوند عالم باشد۔

سلطان نے پھر یہ سوال کیا کہ بیت المال میں مجھے اور میرے فرزندوں کو کیا حق حاصل ہے؟

مغیث الدین نے جواب دیا:

اگر خداوند عالم اہل جہاد را دو بست سی و چہار تنکہ تعین کردہ است، ہماں مقدار خداوند عالم را از برای نفقہ خاصہ و حرم خود باید داشت . . . . اگر خداوند عالم بیشتر بردارد و لک ہا و کرو ڑہا وزرینہ ہا و مرصع ہا اعطا ہی حرم کند، جواب آں در قیامت باز پرس شود۔

یعنی اگر شریعت کی مقرر کردہ رقم سے سلطان زیادہ لے گا تو قیامت کے دن اس سے باز پرس ہو گی۔ سلطان قاضی کا جواب سن کر سخت برہم ہوا اور کہا:

از تیغ من نمی ترسی و می گوئی کہ چندیں مال ہا کہ در حرم من خرچ می شود مشروع نیست۔

قاضی نے جواب دیا:

من از تیغ خداوند عالم ترسم وکفن خود را، کہ آں دستار من است، برابر می آرم۔

یعنی میں صرف خداوند کائنات سے ڈرتا ہوں اور اپنا کفن جو میری دستار ہے، برابر ساتھ رکھتا ہوں۔

یہ مثال ایک عالم دین کی حق گوئی کی تھی، جس میں ان کے لیے خطرہ جان بھی ہو سکتا تھا۔ بہرحال آزادی سے دیئے ہوئے مشورے کی، قدر کی گئی۔

بادشاہ کا سب سے بڑا وصف

۱۔ عزم درست اور ظلم و استبداد میں فرق ہے۔ بادشاہ کا بہت بڑا وصف یہ ہے کہ اس کا ارادہ مضبوط اور راستی پر مبنی ہو۔ ایسا ارادہ پیرایۂ بادشاہت ہوتا ہے۔ برنی لکھتا ہے کہ، ہو سکتا ہے کہ بادشاہ کو اپنے عزم کو بروئے کار لانے کے لیے قانون کا احترام نہ کرنے والوں پر تعدی بھی کرنی پڑے۔ اس صورت میں عزم درست اور ظلم و استبداد بادی النظر میں ایک ہی نظر آئیں گے۔ لیکن اصطلاحی زبان میں یہ دونوں ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہوں گے۔ عزم درست کی بدولت بادشاہ کے سیاسی منصوبے جلد اور بآسانی تکمیل پا سکیں گے اور دوست دشمن کی نظروں میں ان کا وقار بڑھے گا۔ حریفوں کے دلوں میں اس کی ہیبت برقرار رہے گی۔ رعایا کو یقین

ہو گا کہ بادشاہ اگر کوئی مہم شروع کرے تو اس وقت تک اس کا قدم پیچھے نہیں ہٹتا جب تک اس کی تکمیل نہ کر لے۔ رعایا کا بادشاہ کی قوت ارادی پر یقین ملکی نظم و نسق میں بہت مفید ثابت ہوتا ہے

عزم درست پیرایہ بادشاہی و حلیۂ جہانداری است و جہانداراں کہ پیش ازما جہان را بعدل و احسان منتظم و ملتئم می داشتند، فرمودہ اند کہ عزم درست در جہانداری شرط لازم است کہ ہرچند بادشاہ در مصالح جہانداری و مہمات ملکی درست عزمی کند و تزلزل و تخلل را در پرداخت امور کار نفرماید و مصالح جہانداری و مہمات جہانبانی او زودتر و آسان تر برآید و عزت او در دل موافق و مخالف بیشتر متمکن گردد و امیدواری ثبات او، کہ عمدہ کار جہانبانیست، در دل ہای حاضر و غائب بہتر و منتقش شود و ہراس او از سینۂ ہمسراں کم نگردد و در اعتقاد ہا راسخ شود کہ ہر قصدی کہ بادشاہ می کند، ناتمام نمی کند، از آن مہم دست نمی دارد۔

عزم اچھا بھی ہو سکتا ہے اور برا بھی۔ تعمیر کے لیے بھی ہو سکتا ہے اور تخریب کے لیے بھی۔ حصول دنیا کے لیے بھی ہو سکتا ہے اور حصول عقبیٰ کے لیے بھی، اور ظاہر ہے کہ اس کے نتائج، اچھے بھی ہوں گے اور برے بھی۔

بادشاہ کا عزم اگر رعایا کی فلاح و بہبود، نیکی، اچھی شہرت اور نیک انجامی کے لیے ہو گا تو اس کا عزم، عزم درست کہلائے گا۔ اس عزم پر ثابت قدم رہنا اس کے لیے باعث فخر ہو گا لیکن اگر یہ عزم شر اور بدی کی خاطر ہو گا جو ملک کی پریشانی، تباہی، بدانجامی کا موجب بنے تو یہ عزم ظلم و استبداد سمجھا جائے گا۔

و ہر قصدی کہ در فساد و شر و در لا یمکن و ابتری و موجب بدنامی و بغض عامہ و مشاق و وسیلت و خامت عاقبت و ابتری و پریشانی بود، آنرا استیثش و استبداد گفتہ اند۔

بادشاہان اسلام کا یہ فرض ہے کہ کسی حکمت عملی یا مہم کا آغاز کرنے سے پہلے اس کی کامیابی یا ناکامی پر غور کر لیں، نیز یہ سوچ لیں کہ ان کے اثرات بادشاہ، دین، ملک، فوج اور عوام پر کیا ہوں گے۔ اس سلسلے میں انھیں چاہیے کہ اپنے مشیروں کے ساتھ اپنی حکمت عملی کے ہر ہر پہلو پر مشورہ کر لیں۔ اگر وہ متفق ہوں تو وہ اپنی حکمت عملی کو عوام پر واضح کر دیں، پھر اس پر قائم رہیں اور اسے بروئے کار لانے میں ہر ممکن کوشش کریں۔ اس کے لیے خزانے کی تمام رقوم صرف کر دی

پڑیں تو دریغ نہ کریں۔ برنی نے یہ بھی کہا ہے کہ بادشاہان اسلام کا یہ فرض بھی ہے کہ وہ اپنی فعول میں رسول اکرمؐ اور خلفائے راشدین کے عزائم سے بھی ہدایت حاصل کریں۔ اس سلسلے[113] میں برنی نے جو مثالیں دی ہیں ان میں حضرت ابو بکر صدیقؓ کے حصول زکوٰۃ کے عزم کی مثال خاص طور سے بہت اہم ہے۔

عدل کی اہمیت

عوام کی خوش حالی اور ولداری کا انحصار عدل و انصاف پر ہے۔ عدل، مذہب کا لازمہ ہے اور مذہب عدل کا۔ معاشرے میں یہ ممکن نہیں کہ لوگ ایک دوسرے کے ساتھ تعلقات رکھے بغیر زندگی گزار سکیں۔ معاشرے میں چھوٹے بھی ہیں اور بڑے بھی، طاقت ور بھی ہیں اور کمزور بھی، اچھے بھی ہیں اور برے بھی، دانا بھی ہیں اور کم عقل بھی، پڑھے لکھے بھی ہیں اور ناخواندہ بھی، شہری بھی ہیں اور دیہاتی بھی، مقیم بھی ہیں اور مسافر بھی، مسلم بھی ہیں اور غیر مسلم بھی، حکمران بھی ہیں اور عوام بھی۔ عدل ہی ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے سب کے مابین توازن قائم رکھا جا سکتا ہے۔

"عدل نزاز دی است کہ بداں معاملات حق و ناحق سختہ گردد و استحقاق و غیر استحقاق بعدل پیدا آید و ظلم و تعدی و غضب و غارت ازاں مبرہن می گردد۔ پس معاملات عدل را بی عدل پائیداری نماند و ہر دینی کہ آں متعلق احکامی بود، بی عدل چارہ نباشد۔ محققان اولین و آخرین گفتہ اند کہ "الدین والعدل توامان"۔ عدل و دین دوگانہ از یک مادر اند۔"[114]

اگر دنیا میں عدل نہ رہے تو کوئی انسان امن چین کی زندگی بسر نہیں کر سکتا۔

"اگر در جہاں عدل و انصاف نباشد، اباحت محض شود و ہیچ تفرقہ در ملک و غیر ملک نماند و ہیچ زمانی و اوانی جہاں از فتنہ خالی نشود و ہیچ یکی از بنی آدم نتواند کہ کوزۂ آبی در گوشۂ بی غمی تجرع نماید و یا یک شبی بر بستر امان پای دراز بکند و بخسپد۔"[115]

برنی کہتا ہے کہ عدل قائم رکھنے کے لیے بااختیار اور قوی حکمرانوں کی ضرورت ہے کیونکہ اگر دنیا کے دانشور، بااختیار عادلوں کے بغیر یہ چاہیں کہ محض حکمت عملی اور عقل مندی سے ایک دیہہ یا ایک گھر ہی کا نظم و نسق چلائیں تو وہ کامیاب نہیں ہو سکتے۔ معاشرتی نظام اور ملکی نظم و نسق کا دارومدار عدل و انصاف پر ہے جس کے قائم کرنے کے لیے طاقتور حکمران کی ضرورت ہے

حکمرانوں کی برتری اور ان کی قوت و شوکت کا جواز اسی میں ہے کہ وہ ملک میں عدل و انصاف قائم رکھ سکیں، اختیار اور اقتدار ہی کے ذریعے وہ دوسروں پر زیادتی کرنے والے طاقتوروں کے ہاتھ روک سکتے ہیں۔ نیکی، خدمت، اور مہر و محبت کے کام عدل و انصاف ہی سے انجام پا سکتے ہیں۔ آنحضرتؐ نے فرمایا ہے: "عدل ساعۃ خیر من عبادت سبعین سنۃ" یعنی ایک ساعت کا عدل ہفتاد سالہ عبادت سے بہتر ہے۔

حکمران کو عادل اسی وقت کہا جاسکے گا کہ ملک میں ناانصافی باقی نہ رہے اور ظلم و تعدی کرنے والوں کا خاتمہ ہو جائے۔ اگر ملک بھر میں کوئی ایک بھی ظلم کرے اور حکمران کے علم کے باوجود اس کا ظلم جاری رہے تو وہ حکمران عادل اور غیر جانبدار نہ ہوگا۔

عادل بادشاہ کے اوصاف

برنی حکما کے حوالے سے بتاتا ہے کہ جس حکمران کو عدل جبلّی عطا ہوا ہے، وہ مندرجہ ذیل اوصاف کی وجہ سے ممتاز ہے:

۱۔ وہ مظلوموں کا حامی اور کمزوروں کو حفاظت میں رکھنے کا خواہش مند ہوتا ہے۔ نامنصف لوگوں سے اسے نفرت ہوتی ہے اور ظالموں کا وہ دل سے دشمن ہوتا ہے۔

۲۔ اپنے دشمنوں کے خلاف فیصلہ دیتے ہوئے بھی اسے بدلہ یا انتقام لینے کا خیال نہیں آتا۔

۳۔ وہ غلطیوں کو برداشت نہیں کرسکتا نہ ان سے سمجھوتہ ہی کرسکتا ہے اور فیصلہ دیتے وقت وہ اپنی حدود سے باہر نہیں جاتا۔

۴۔ اس کا دل لرزا اٹھتا ہے مبادا ایسا نہ ہو کہ کسی بے گناہ کو سزا مل جائے۔

۵۔ انصاف کرتے وقت کوئی اسے متاثر نہیں کرسکتا۔

۶۔ فیصلہ دیتے وقت نہ وہ کسی نکتہ چینی کی پرواکرتا ہے نہ کسی کی خوشنودی کا خیال کرتا ہے۔

۷۔ فیصلہ دیتے ہوئے اپنے یا حکومت کے نقصان کو خاطر میں نہیں لاتا۔

۸۔ وہ فریب نفس کا شکار نہیں ہوتا، نہ اپنے اصولوں میں لچک پیدا ہونے دیتا ہے۔

۹۔ دوسرے کے دعووں کا فیصلہ کرنے میں اگرچہ وہ سخت ہے لیکن جہاں اس کی اپنی

ذات کا تعلق ہو، وہ معافی دینے کو ترجیح دیتا ہے۔

۱۰۔ اس کا دل اس وقت تک چین نہیں پاتا جب تک وہ کمزور کا حق طاقتور سے نہیں دلا دیتا۔

۱۱۔ وہ کسی کے احسان کا بوجھ قبول نہیں کرتا، مبادا یہ احسان کبھی اس کی قوت فیصلہ کو متاثر نہ کر دے۔

۱۲۔ اگرچہ وہ انصاف ہی کرنا چاہتا ہے لیکن اس کا دل مہربان اور شفیق ہے۔

۱۳۔ اس کا غصہ خدا کے لیے ہے اور دشمنی کا کوئی وحشیانہ جذبہ اسے مشتعل نہیں کرتا۔

۱۴۔ جب وہ کسی مسلمان کی تذلیل کرنے یا سزائے موت دینے کا فیصلہ کرتا ہے تو اسے اپنے اختیارات سے نفرت بھی ہونے لگتی ہے۔

۱۵۔ اس کا ذہن کسی دعوے دار کے دھوکے، فریب اور بہانے کو فوراً مسترد کر دیتا ہے کیونکہ جھوٹ سچ پرکھنے کی کسوٹی اس کے سینے میں ہوتی ہے۔

۱۶۔ اس کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ رعایا کے فیصلے خود کرے۔

۱۷۔ ایسے حکمران کی محبت رعایا کے دلوں میں جاگزیں ہو گی اور اگر اس کے فیصلے سے کسی پر زو بھی پڑے تو وہ حکمران سے نفرت نہیں کرے گا۔

۱۸۔ وہ جب سنتا ہے کہ اس کی مملکت میں کسی سے ناانصافی یا زیادتی ہوئی تو وہ بے چین ہو جاتا ہے۔

۱۹۔ اسے ہر وقت یہی خیال رہتا ہے کہ ناانصافی کرنے والوں کو سرزنش کرے اور عدل کی میزان قائم رکھے۔

۲۰۔ پُرامن شہریوں کے معاملات پر غور کرتے ہوئے، یہ اصول اس کے پیش نظر رہتا ہے کہ سزائیں شہادت پر مبنی ہوں لیکن ظالموں، گنہ گاروں اور مجرموں کے معاملات میں جو فطرتاً جرم و عصیان پر مائل ہیں، انھیں شک کا کوئی فائدہ نہ ملے۔

مساوات خاص اور مساوات عام

مساوات اسلام کا بنیادی اصول ہے۔ علمائے دین نے بادشاہت کے نقطۂ نظر کو

پیش نظر رکھ کر مساوات کی دو قسمیں بتائی ہیں، مساواتِ خاص اور مساواتِ عام۔ مساواتِ خاص دعوے داروں کی برابری کے حق سے متعلق ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ خلیفہ، بادشاہ، قاضی، گورنر، سرکاری عہدے دار، گویا ہر وہ شخص جسے کسی نہ کسی صورت میں فیصلہ دینے کا اختیار حاصل ہے، مدعی اور مدعا علیہ کے درمیان مساوات قائم رکھے۔ مقدمے کی سماعت کے دوران ان سے یکساں سلوک کرے۔ انھیں اپنے سامنے بیٹھنے یا کھڑا ہونے کی ایک سی رعایت دے اور کسی وجہ سے ایک کو دوسرے پر ترجیح نہ دے۔ فیصلہ سناتے ہوئے یہ امر خاطر میں نہ لائے کہ کوئی طاقت ور ہے یا امیر، فریق ثانی حکومت ہے یا سرکاری افسر۔ کسی کے وقار، مرتبہ اور عظمت کا خیال غیر جانبدارانہ فیصلہ دینے میں حائل نہ ہو۔ عدل کرتے ہوئے وہ اپنے یا بیگانے، سربرآوردہ یا کم اصل، بے کار یا باکار، سرکاری عہدے دار یا شہری، امیر یا غریب، شریف یا عامی، بہی خواہ یا مخالف، دوست یا دشمن غرض سب کو ایک نظر سے دیکھے۔ کسی دعوے دار سے تحفے قبول نہ کرے، خواہ وہ کسی نوعیت کے ہوں۔ رشوت نہ لے۔ انصاف کرتے ہوئے نہ حکومت کی کسی حکمت عملی کو خاطر میں لائے، نہ ماں باپ، بہن بھائی اور اولاد کی محبت ہی کو انصاف کے تقاضوں میں خلل انداز ہونے دے۔ اسے نہ یہ ڈر ہو کہ فیصلہ دینے میں اس کے اقتدار کو زوال آجائے گا، نہ یہ اندیشہ کہ لوگ اس کی مخالفت پر اتر آئیں گے۔ وہ نہ کسی کی خوشنودی کا خیال دل میں لائے نہ کسی کی سفارش ہی اس کی دامن گیر ہو۔ عدل کا تقاضا یہ ہے کہ فیصلہ دیتے وقت متذکرہ بالا اصول پیش نظر رکھے جائیں۔ جو شخص ان سے روگردانی کرتا ہے عادل نہیں ہو سکتا۔

عدل کی ایک ساعت کا صلہ متذکرہ شرائط کے پیش نظر، ستر سالہ عبادت سے زیادہ ہوتا ہے۔ جس حکمران کو عدل خدا کی طرف سے ودیعت کیا گیا ہے وہ ایک ساعت کے عدل کو نافذ کرنے کا اہل ہوگا، اور روحانی صلہ جو اسے ملے گا، اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن جس حکمران کو قدرت نے عدل کی صفت ودیعت نہیں کی، وہ متذکرہ بالا شرائط کا پابند نہیں رہ سکے گا۔

مساواتِ عام سے یہ مراد ہے کہ حکمران اور رعایا کے مابین مساوات ہو۔ بحیثیت انسان رعایا کے برابر ہونے کا خیال حکمران کو زہد و تقویٰ میں کمال حاصل ہونے کے بعد ہی آسکتا ہے۔ یہ وصف خلفائے راشدین ہی سے مخصوص ہے۔ البتہ اس کا پرتو ہمیں اموی خلیفہ عمر بن عبد العزیز

کے زمانے میں بھی نظر آتا ہے۔ مساوات خاص کی یہ مثال ہے کہ خلیفہ جسے وسیع مملکت پر جمشید اور خسرو کا سا اختیار حاصل ہے، نہ صرف دعوے داروں میں مساوات کا اصول بروئے کار لاتا ہے بلکہ عوام کی سی زندگی گزارتا ہے۔ اس کا لباس اور خوراک بھی غربا کی طرح ہوتا ہے۔ وہ بیت المال سے صرف اسی قدر رقم لیتا ہے جو اس کی ضروریات کے لیے کافی ہو۔ غلاموں کو وہ ویسا ہی لباس دیتا ہے جیسا خود پہنتا ہے۔ انھیں ویسی ہی خوراک دیتا ہے جیسی وہ خود کھاتا ہے۔ شاہانہ اختیار اور غربت کی یک جائی رسول اکرمؐ کا معجزہ ہے جس کی پوری پوری پیروی خلفائے راشدین نے کی۔

برنی سلطان محمود کے حوالے سے لکھتا ہے:

باری تعالیٰ آسمان وزمین را بعدل قائم می دارد کہ بالعدل قامت السموٰت والارض و از گاہ آدم الیٰ یومنا جہاں بعدل و انصاف عادلاں و منصفاں معمور ماندہ است و نیز دینی راکہ از حق و باطل فرض کنند، جریان احکام آں بعدل میسر شدہ است و آناں کہ روی خود را بدعویٰ خدائی سیاہ کردہ اند، ہم مناسب دین و مذہب و رسم و عادت خود صورت عدل محافظت کردہ اند۔

ارض و سما خدائی عدل کی بنیاد پر قائم ہیں۔ آدمؑ سے لے کر اب تک دنیا کی خوش حالی، مساوات پسند انسانوں کے عدل کے باعث جاری ہے۔ ہر مذہب، خواہ وہ سچا ہے یا جھوٹا، اس کے قوانین عدل ہی کی بنیاد پر قائم رہے، اور تو اور زمانہ سلف کے حکمران جو خدائی کا دعویٰ کر کے روسیاہ ہوئے انھوں نے بھی مروجہ مذہب، عقائد و روایات اور اس زمانے کے طور طریقوں کے مطابق عدل قائم کیا۔

مساوات عام اور مساوات خاص کا فرق ظاہر کرنے کے لیے برنی نے حضرت عمر بن خطابؓ اور نوشیروان عادل کی مثال دی ہے۔ دونوں کا عدل و انصاف شہرۂ آفاق تھا۔ عرب اور ایران کے دانش ور اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت عمرؓ مساوات عام کے مطابق عدل کرنے کے ساتھ ساتھ مساوات خاص کے تقاضے بھی پورے کرتے تھے۔ مساوات خاص کے لیے مساوات عام نہایت ضروری شرط ہے۔ لیکن مساوات خاص مساوات عام کے لیے ضروری شرط نہیں۔ عرب اور ایران کے رہنماؤں کا قول ہے کہ حضرت عمرؓ نے وہ سب کچھ کیا جو نوشیروان نے کیا تھا لیکن نوشیرواں

وہ نہ کر سکا تھا جو حضرت عمرؓ نے کیا۔ کیونکہ زہد، تقویٰ، حبِ دنیا کا ترک اور ایثار مساوات خاص کے لیے اولیں شرائط ہیں۔

عسکری نظام

برنی کے زمانے میں سلاطین کو جہاں نئی فتوحات کی امنگ ہوتی تھی، وہاں باغیوں، فتنہ پردازوں اور شورش پسندوں کا بھی سامنا کرنا پڑتا تھا۔ نظم و نسق کی استواری، ملکی امن و امان آزادانہ تجارت کی ضمانت، اجناس کے نرخوں کا اضافہ بھی اہم ملکی مسائل تھے جن کے لیے عسکری نظام کو مستحکم کرنے کی ضرورت تھی۔ برنی کے نزدیک عسکری نظام کے استحکام کو دوسرے تمام امور پر اولیت حاصل تھی۔ چنانچہ اس نے خاصی تفصیل سے اس نظام پر روشنی ڈالی ہے اور حسبِ معمول اپنے نظریہ کی تائید و حمایت کے لیے زمانۂ سلف کے سلاطین، وزرا اور حکما کے اقوال کی طرف رجوع کیا ہے۔

برنی کیخسرو کا حوالہ دیتا ہے کہ اس کا یہ نظریہ تھا کہ "بادشاہت فوج سے عبارت ہے اور فوج بادشاہت سے، بادشاہت کے دو ستون ہیں۔ پہلا ستون نظم و نسق ہے اور دوسرا فتوحات۔ ان دونوں کا انحصار فوج پر ہے۔

برنی جمشید کی طرف رجوع کرتے ہوئے کہتا ہے: اس کا یہ نظریہ تھا کہ بادشاہت کی بنیاد فوج، عدل و انصاف اور مراحم خسروانہ پر قائم ہے۔ اگر فوج کے ذریعے ملک کو وفا شعار نہ بنایا جائے، باغیوں کی سرتابی کو اطاعت میں نہ بدلا جائے اور عسکری قوت سے ملکی نظم و نسق کو مستحکم نہ کیا جائے تو نہ عدل قائم رہ سکتا ہے، نہ مراحم خسروانہ کا سلسلہ جاری رہ سکتا ہے

اصل عبارت یہ ہے:

جمشید علیہ گفت کہ اگر جہاں را بہ حشم فرد نکوبند و تمرد و طغیان متمرداں و طاغیان عالم باطاعت و فرماں برداری راست نہ ایستانند و از قوت و شوکت حشم التیام و انتظام در جہاں پیدا نیار ند جریان عدل و احسان ممکن نگردد۔

آگے چل کر برنی لکھتا ہے: سکندر نے ارسطو سے سوال کیا کہ فوج کی بیشی اور اس کی موزوں تنظیم کا انحصار کن باتوں پر ہے۔ ارسطو علیہ نے جواب دیا کہ فوج کی بیشی اور اس کے استحکام کی

چار شرائط ہیں:

۱۔ بادشاہ کی تمام تر توجہ عسکری امور پر ہونی چاہیے اور کبھی کسی وجہ سے اسے عسکری امور سے غافل نہیں رہنا چاہیے۔ اسے جان لینا چاہیے کہ اس کی اپنی زندگی کا انحصار بھی فوج کی جاں نثاری پر ہے۔

۲۔ فوج کی تعداد میں اضافہ اور اس کی تنظیم کا انحصار اس بات پر ہے کہ اس کی ضروریات کے لیے بے دریغ خزانہ خرچ کیا جائے۔

۳۔ فوج کے افسران ماتحتوں سے مہر و محبت کا سلوک کریں۔ ان میں وہ صفات ہونی چاہئیں جو دانش ور بیان کرتے چلے آئے ہیں۔ بادشاہ کو تو فوج سے ملنے کا موقع کم ہی ہوتا ہے۔ لیکن افسروں اور فوج کا دن رات کا ساتھ ہوتا ہے۔ اگر افسروں میں رہنمائی کی جامع صفات نہ ہوں گی تو فوج معقول طریقے سے منظم و مستحکم نہ ہو سکے گی۔

۴۔ عارض یعنی وزیر و غاع جسے چھوٹے بڑے فوجی حکام کی نگرانی اور امور لشکر کی ذمے داری سونپی گئی ہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ بادشاہ کا وفادار ہونے کے ساتھ قابلِ اعتماد، عسکری امور کا ماہر، دیانت دار، نیک دل، پُروقار، راسخ العقیدہ، شریف الطبع، اور صادق القول ہو۔ جتنا زیادہ وہ وفادار اور جامع صفات ہو گا، اتنی ہی فوجی استعداد بڑھے گی۔

سکندر نے ارسطو سے پھر یہ سوال کیا کہ سالار لشکر میں کیا صفات ہونی چاہئیں؟ ارسطو نے جواب دیا، سالار لشکر میں دس صفات کا ہونا لازمی ہے۔

۱۔ خدا ترسی۔ اگر سالار لشکر خدا ترس نہ ہو گا تو اسے دس سواروں کی سرداری بھی نہیں ملنی چاہیے اگر عقل و تجربہ کے خلاف کسی خدا نا ترس کو سالار لشکر بنایا گیا تو اس کا نتیجہ وہی ہو گا جو ہونا چاہیے۔

۲۔ بادشاہ سے وفاداری۔ سالار لشکر کے لیے ضروری ہے کہ وہ بادشاہ کا وفادار ہو، جس کی وفاداری مشتبہ ہو، اسے فوج میں، جو حکومت کا ایک ستون ہے، کوئی عہدہ نہ دینا چاہیے۔

۳۔ اصابت رائے۔ اگر سالار لشکر صائب الرائے نہ ہو گا، اس کے ماتحت غلط قسم کے خیالات اس کے ذہن میں ڈال سکیں گے اور یہ اس کے لیے اور اس کے ماتحتوں کے لیے نقصان رساں ہو گا۔

۴۔ سالار لشکر معزز خاندان کا ہونا چاہیے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو سپاہ اس سے مامون و مصئون نہ

رہ سکے گی اور وہ ملک اور قوم کی بہتری کا کام نہیں کر سکے گا۔

۵۔ اسے اپنے منصب سے ایسا خلوص ہونا چاہیے کہ اسے چھوڑ کر وہ کوئی دوسرا منصب اختیار کرنے کی خواہش نہ کرے۔

۶۔ اسے جنگوں کا تجربہ ہونا چاہیے ورنہ وہ اپنی، اپنے ملک کی اور سپاہ کی حفاظت نہیں کر سکے گا۔

۷۔ وہ کسی مقتدر قبیلے کا فرد ہونا چاہیے جس کے لواحقین اس کے پیرو ہوں۔ اگر ایسا ہوا تو ہر شخص اس پر اعتماد کرے گا، سپاہ اسے عزت کی نظر سے دیکھے گی اور اس کا قبیلہ اور پیرو اس کے اچھے کردار کے ضامن ہوں گے۔

۸۔ اسے دلیر، ہوشیار اور جنگی امور میں تجربہ کار ہونا چاہیے۔

۹۔ ضروری ہے کہ وہ فیاض طبع ہو تاکہ فوج کی دلداری کر سکے اور فوج کی ضروریات ہر وقت اس کے پیش نظر رہیں۔

۱۰۔ وہ صادق القول اور پاکیزہ قلب و ذہن کا ہو تاکہ فوج اس کے قول و فعل پر بھروسہ کرے۔

اگر سالار لشکر متذکرہ اوصاف کا حامل ہوگا تو اس کا ہر ماتحت مطمئن اور محفوظ ہوگا۔

فوج کی تنظیم کے متعلق برنی سلطان محمود کے حوالے سے لکھتا ہے:

فرزندان محمود و شاہان اسلام کو فوجی تنظیم کے متعلق مندرجہ ذیل اصول پیش نظر رکھنے چاہئیں:

۱۔ جو افسر جتنی فوج کو منظم کرنے کا اہل ہو اس کی کمان میں اس سے زیادہ فوج نہیں دینی چاہیے جو حکمران عقل و شعور کو بالائے طاق رکھ کر ایسا کریں گے، فوج منظم نہ ہو سکے گی۔ اس کا نتیجہ بدنظمی کی صورت میں ظاہر ہوگا اور اس کی ذمے داری خود حکمران پر ہوگی۔ اس کے برعکس اگر کوئی فوجی افسر زیادہ فوج کو منظم کرنے کا اہل ہو اور وفادار بھی ہو تو اس کی کمان میں کم فوج نہیں ہونی چاہیے اس سے اس کی دل شکنی ہوگی۔ فوجی افسروں کی بے اطمینانی کسی صورت میں پسندیدہ نہیں۔ اگر کسی فوجی افسر کو اس کی جاں نثاری اور حسن خدمت کا مناسب صلہ نہ ملے اور غیر مستحق افسر ترقی پائیں تو یقینی بات ہے کہ وہ غیر مطمئن رہے گا اور اس کی وفاداری میں فرق آئے گا۔

۲۔ اگر پچاس ہزار فوج حکومت کے استحکام کے لیے کافی ہو تو اس تعداد پر حکمران کو مطمئن نہ ہو جانا

چاہیے بلکہ اس کی نصف تعداد اور بھی مسلح اور منظم کرنی چاہیے تاکہ ضرورت کے وقت وہ بے بس ہو کر نہ رہ جائے۔ یہ خیال رہے کہ ایسی اضافی فوج میں ناتجربہ کار اور ناقابل اعتماد لوگ نہ لیے جائیں۔ ایسے لوگ محض بے کار رہیں گے اور نازک صورتِ حال میں خطرناک بھی ثابت ہوں گے۔

حکمران کو چاہیے کہ وزارت دفاع کے کام کا جائزہ سال میں دو مرتبہ ضرور لے۔ اگر اضافی فوج اس کے سامنے سے نہ گزاری جائے تو سمجھ لیا جائے کہ وزارت کا کام تسلی بخش نہیں۔ یہ زمانہ آشوب اور تغیر کا زمانہ ہے۔ کسی جگہ کوئی مسئلہ ختم ہوتا ہے، تو دوسری جگہ کوئی مسئلہ ابھر آتا ہے اس لیے فوجی تنظیم مستحکم ہونی چاہیے۔ حکمران فرمان جاری کرے کہ ہمیشہ نئے جوان بھرتی کرتے رہیں، بھرتی کا دروازہ بند نہیں ہونا چاہیے۔ اسے جان لینا چاہیے کہ اگر کسی وجہ سے فوجی افسر یا گورنر یہ سمجھ پائیں کہ حکمران، فوجی استعداد بڑھانے کی طرف توجہ نہیں دیتا، یا دولت جمع کرنے کی خواہش اسے ایسا کرنے سے باز رکھتی ہے تو فوج کی تعداد نہیں بڑھ سکے گی اور جو فوج موجود ہے وہ مستحکم اور منظم نہیں ہو سکے گی بلکہ رفتہ رفتہ اس کی تعداد اور استعداد کم ہوتی جائے گی۔

۴۔ فوج کو کبھی بے کار نہیں رہنا چاہیے۔ اس سے جفاکشی اور ملکی مفاد کے کام لیتے رہنا چاہیے۔

قیمتوں کا تقرر

ہمارے روزمرہ میں یہ حقیقت بار بار سامنے آتی ہے کہ اناج اور دوسری اشیائے صرف کی قیمتیں ہر آئے دن بڑھتی رہتی ہیں۔ اس کا سلطانی دور کے لوگوں کو بھی سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اس کی وجوہ خشک سالی، غلے اور دیگر اشیا کی کم یابی، مانگ میں اضافہ، افراطِ زر، ہوسِ ذخیرہ اندوزی، اسمگلنگ وغیرہ ہوتی ہیں۔ ان وجوہ کی بنا پر ملک میں غلے اور دیگر اشیائے صرف کی کمی ہو جاتی ہے اور قیمتوں کے بڑھنے کا سبب بنتی ہے۔ چیزوں کی قیمتوں کا مسئلہ خالصتاً اقتصادی مسئلہ ہے لیکن ملکی امن و امان کے لیے غیر یقینی حالت کو ختم کرنا اور اشیائے ضروریہ کی قیمتوں کو کم کر کے انھیں مستحکم کرنا ایک سیاسی مسئلہ بھی ہے جس کا تعلق حکومت سے ہے۔

چیزوں کی قیمتیں مقرر کرنا خاصہ مشکل مسئلہ ہے۔ اس سلسلے میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا زراعت پیشہ لوگوں، صناعوں اور دوسرے پیشہ وروں کی محنت سے حاصل کی ہوئی چیزوں پر انھیں ملکیت کا حق ہے یا نہیں؟ اور کیا قانوناً وہ مرضی کے مطابق اپنی اشیا فروخت کر کے

منافع حاصل کر سکتے ہیں یا نہیں ؟ یہ مسئلہ علما اور دانشوروں کی توجہ کا مرکز بنا رہا ہے۔ پیشتر اس کے کہ برنی کا نظریہ پیش کیا جائے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان علمائے دین کے فتاویٰ کا ذکر کر دیا جائے جنھوں نے اس مسئلے کے مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں کی وضاحت کی ہے۔ بعض علما کا خیال ہے کہ اشیا کی قیمتیں مقرر کرنا جائز ہے اور بعض یہ کہتے ہیں کہ قیمتیں مقرر کرنا جائز نہیں البتہ اس صورت میں جائز ہے کہ عوام کی تکلیف کو دور کرنے کے پیش نظر قیمتیں مقرر کر دی جائیں جیسا کہ الکافی میں آیا ہے:

" ویکرہ[19] الاحتکار فی اقوات الآدمیین والبھائم وقال بعدہ الاحتکار المنھی فی الاشیاء التی ھی قوت الناس والبھائم کالبر والشعیر والعنب والتمر والتین و القت فی قول ابی حنیفۃ ومحمد رحمہما اللہ وعلیہ الفتویٰ وقال ابو یوسف کل ما اضر بالعامۃ حبسہ فھو احتکار وان کان ذھباً او فضۃ او ثوباً فاعتبر الضر اینما وجد وان لم یکن معھوداً وھما اعتبرا الضرر المعتاد الغالب ثم قال ولا ینبغی للسلطان ان یسعر علی الناس لقولہ علیہ السلام لا تسعروا فان اللہ ھو المسعر القابض الباسط ثم قال لان الثمن حق البائع والیہ تقدیرہ فلا ینبغی للامام ان یتعرض لحقہ الا اذا تعلق دفع ضرر العامۃ بان یبیع قفیزاً بمائۃ وھو مشتری بخمسین فیمنع منہ دفعاً للضرر عن المسلمین وقال مالک رح لزم التسعیر علیہ عام الغلاء نظراً للعامۃ وذکر فی شاھان الاحتکار انما یکرہ لضرر الناس فکل ما یتضرر بہ الانسان فھو مکروہ ثم قال ومن ارتکب شیئاً ھذا فانہ یعذر "

ترجمہ: آدمیوں اور جانوروں (مویشیوں) کی خوراک کی ذخیرہ اندوزی کو مکروہ خیال کیا گیا ہے۔ اس کے بعد اس نے یہ کہا کہ جس ذخیرہ اندوزی سے روکا گیا ہے وہ ان اشیا کے بارے میں ہے جو انسانوں اور چوپایوں کی خوراک میں شامل ہیں مثلاً گندم، جو، انگور، کھجور، انجیر اور غلے کی اقسام، یہ نظریہ امام ابو حنیفہ اور امام محمد کا ہے اور اس پر فتویٰ ہے۔ امام ابو یوسف کا قول ہے کہ ہر وہ چیز جس کو روکنے سے عوام کو تکلیف ہو، ذخیرہ اندوزی کہلاتی ہے، خواہ سونا ہو یا چاندی یا کپڑے۔ بہر حال (عوام کی) تکلیف ہی کا خیال رکھا گیا ہے، خواہ کہیں بھی ہو اور دونوں ائمہ نے تکلیف ہی کو پیش نظر رکھ کر فتویٰ دیا ہے۔ پھر اس نے کہا کہ حاکم وقت کے لیے جائز

نہیں کہ وہ قیمت مقرر کر دے کیونکہ آنحضرت ؐ کا ارشاد ہے کہ قیمتوں کی تعیین تو حکم الٰہی سے ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی تنگی اور فراخی کا مالک ہے اور قیمتیں بھی وہی مقرر کرتا ہے۔ قیمت مقرر کرنا دراصل بیچنے والے کا حق ہے اور اسی کو زیب دیتا ہے کہ وہ قیمت مقرر کرے۔ حاکم وقت کو اس کے حق میں دست اندازی نہ کرنا چاہیے۔ البتہ جب عوام کی تکلیف کو دور کرنا مقصود ہو تو قیمت مقرر کرنے کا حق حاکم کو مل سکتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر پچاس پیسوں کی روٹی ایک سو پیسوں میں فروخت ہونے لگے تو پھر حاکم دخل دے کر اس کو روک سکتا ہے تاکہ مسلمان عوام کو تکلیف نہ ہو۔ امام مالکؒ کا قول ہے مہنگائی کے موسم میں عوام کی سہولت کی خاطر قیمتوں کا مقرر کر دینا حاکم کے لیے ضروری ہے۔ ذخیرہ اندوزی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اسے لوگوں کی تکلیف کے پیش نظر مکروہ سمجھا جاتا ہے۔ ہر چیز، جس سے انسان کو تکلیف پہنچے، مکروہ ہے۔ پھر اس نے کہا کہ ہر وہ شخص، جو ایسے جرم کا ارتکاب کرتا ہے، سزا کے لائق ہے۔

بادشاہوں نے اشیائے صرف کی قیمتوں کو کم کرنے کے متعلق جو سوچا اور جو اقدامات کیے ان کا مفصل ذکر برنی نے کیا ہے۔ سلطان محمود غزنوی کی زبانی یہ کہا ہے:

ای فرزندان محمود وای بادشاہان اسلام! ..... اتفاق جماہیر خواص و عوام است کہ از گرانیٔ اسباب معیشت سکان مملکت و رعایای ملک ہم بہ تنگ آیند، و ہر ہمہ و یا بیشتر پریشان و تلف شوند و ترک اوطان مالوف و مساکن قدیم گیرند، و درخ بدال اقالیم نہند کہ در آنجا اسباب معاش بآسانی و ارزانی شنوند پس حکم مقدمات مذکور جہانداران واجب و لازم است کہ در ارزانی استعداد حشم از اسپ و اسلحہ و ما یتعلق بہم غلات و اقمشہ، کہ بمعائش خواص و عوام رعایا و ملک متعلق است، کوشش فراوان و جہد کلی نمایند و استقامت ملک خود را باستقامت حشم و استقامت عامہ متعلق دانند و استقامت و ارزانیٔ اسباب معاش تصور مکنند۔

یعنی جمہور خواص و عوام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اسباب معیشت کی گرانی کی وجہ سے رعایا پریشانی میں مبتلا ہو جاتی ہے اور پوری رعایا یا اس کا بیشتر حصہ تباہ حال رہتا ہے۔ اس صورت میں وہ اپنے محبوب وطن کو ترک کر کے ایسی جگہ چلے جاتے ہیں جہاں ضروریات زندگی ارزاں ہوں اور بآسانی مل سکیں پس مذکورہ بالا بیان کے مطابق بادشاہوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ لشکر کی ضروریات زندگی مثلاً گھوڑے، اسلحہ نیز اناج، کپڑا وغیرہ جس کا تعلق عوام و خواص

رعایا سے بھی ہے، کی ارزانی کے لیے انتہائی کوشش کریں اور سمجھیں کہ ملکی استقامت کا انحصار لشکر کے استحکام اور رعایا کی بہبودی پر ہے اور لشکر اور عوام کی فلاح کا انحصار قیمتوں کے کم ہونے پر ہے۔

قیمتوں کے کنٹرول کے متعلق برنی کی تاریخ فیروز شاہی میں علاء الدین خلجی کے باب میں مفصل ذکر آیا ہے جس کا ماحصل ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:

"کائنات میں کھانے، پینے، پہننے اور رہنے سہنے کی سہولتیں سب کے لیے مساوی ہیں۔"

یہ ارشاد ربانی ہے۔ علاء الدین خلجی کی رعایا میں ہندو، مسلم، اور اچھوت سبھی شامل تھے۔ قرآن پاک کے اس ارشاد کی روشنی میں انسانوں کی بنیادی ضرورتوں کو پورا کرنے کا مسئلہ اس کے پیش نظر رہتا تھا۔ شیخ نصیر الدین چراغ[52]، قاضی حمید ملتانی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

قاضی حمید ایک دن ایوان شاہی میں داخل ہوا تو سلطان علاء الدین خلجی مسند پر بیٹھا ہوا تھا اور پاؤں زمین پر مار رہا تھا۔ اس کے سر پہ ٹوپی تھی نہ پاؤں میں جوتا، کسی گہری سوچ میں مستغرق تھا۔ قاضی سلطان کے سامنے گیا لیکن سلطان بدستور اپنی سوچ میں محو تھا۔ آخر وہ ایوان سے باہر آگیا اور ملک قرابیگ سے ملاقات ہوئی۔ صورت حال اسے بتائی تو دونوں ایوان میں آئے۔ قرابیگ سلطان سے باتیں کرنے لگا۔ آخر قاضی نے بھی موقع پاکر دریافت کیا، حضرت عالی کس سوچ میں تھے۔ سلطان نے کہا، کچھ عرصے سے ایک خیال میرے ذہن میں بار بار آتا ہے کہ خدا کی اس وسیع سرزمین میں بے شمار مخلوق ہے لیکن خداوند تعالیٰ نے اس کی حکمرانی کے لیے مجھے منتخب کیا ہے۔ اب مجھے کوئی ایسا کام کرنا چاہیے جس سے تمام مخلوق کو فائدہ پہنچے۔ لیکن میں کیا کر سکتا ہوں! اگر اپنے خزانے، بلکہ ایسے سیکڑوں خزانے مخلوق میں بانٹ دوں تو بھی ان کے لیے کافی نہ ہوں گے۔ گاؤں اور دیہات بھی لوگوں کو دے دوں تو اس سے سب کی ضرورتیں پوری نہ ہو سکیں گی۔ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اگر اناج اور ضروریات صرف کے نرخ کم کر کے مستحکم کر دوں تو اس کا فائدہ عوام و خواص کو پہنچے گا۔

برنی یہ بھی لکھتا ہے کہ سلطان علاء الدین خلجی نے وزیروں اور مشیروں کے مشورے سے قیمتوں پر کنٹرول کرنے کے لیے درج ذیل ضابطے نافذ کیے:

۱- اناج کا دربار میں نرخ مقرر کیا جائے گا۔ چنانچہ نرخ جو مقرر کیے گئے درج ذیل ہیں:
گندم ۷½ جیتل فی من، جو ۴ جیتل فی من، دھان ۵ جیتل فی من، ماش ۵ جیتل فی من، موٹھ تین جیتل فی من۔

۲- حکومت غلہ خرید کر ذخیرہ کرے گی۔ مقصد یہ ہے کہ موسم خشک رہے اور غلہ کمیاب ہو تو سرکاری غلہ منڈی میں لاڈالا جائے اور سرکاری نرخ پر لوگوں کے ہاتھ بیچا جائے تاکہ احتیاج کے مطابق انھیں غلہ بآسانی مہیا ہو سکے۔

۳- منڈی کے احتساب کے لیے کوتوال مقرر کیا جائے گا، جسے پورے اختیار حاصل ہوں گے۔ سلطان کا فرمان تھا کہ قصبوں میں، خاص طور پر دوآبے کے قصبوں میں لگان کے عوض غلہ وصول کریں اور اسے شہر میں لائیں اور سلطانی ذخیروں میں محفوظ کریں۔ کوئی نیا شہر فتح ہو تو حاصل ہونے والے غلے کا نصف حصہ سلطانی غلے کی صورت میں لیا جائے اور شہروں اور قصبوں میں غلے کے ذخیرے کیے جائیں۔ اس غلے کو شہر کے سوداگروں کے ہاتھ فروخت کریں تاکہ وہ اسے دہلی میں لائیں۔ دہلی میں اس قدر غلہ جمع ہو جاتا کہ کوئی محلہ ایسا نہ تھا جہاں غلے کے تین ذخیرے نہ رکھے گئے ہوں۔ جب کبھی خشک سالی ہوتی یا غلہ لانے والے کارواں کچھ کوتاہی کرتے تو سلطانی ذخیرہ سے غلہ منڈیوں میں لاڈالا جاتا اور سلطانی نرخ پر لوگوں کے ہاتھ ان کی ضرورت کے مطابق فروخت کر دیا جاتا۔

۴- شہروں کے بیوپاریوں کے نام درج رجسٹر کیے جائیں گے۔ یہ بیوپاری منڈی کے کوتوال کے احکام کے تابع ہوں گے۔

۵- رعایا دس من سے زیادہ غلہ ذخیرہ نہ کر سکے گی۔ خراج وصول کرنے میں سختی روا رکھی جائے گی تاکہ کاشت کار بیوپاریوں کے ہاتھ غلہ فروخت کرنے پر مجبور ہو جائیں۔

غلہ کی ذخیرہ اندوزی کی سخت ممانعت تھی۔ سوداگروں، کاشت کاروں، دکانداروں اور دوسرے لوگوں میں سے کسی کے لیے ممکن نہ تھا کہ ایک من غلہ کا بھی ذخیرہ کر سکے یا اپنے گھر پر خفیہ طور پر من یا نیم من غلہ، نرخ سلطانی سے زیادہ قیمت پر فروخت کر سکے۔

۶- کارکنوں کے لیے یہ حکم تھا کہ رعایا سے غلہ اہل کارواں کو فصل کے اٹھانے کے وقت قیمتاً

ولا دیا جائے۔ انھیں یہ حکم بھی تھا کہ رعایا سے مالیہ شدت سے طلب کریں کہ ان کے لیے غلے کو گھر سے جانا اور ذخیرہ کرنا ممکن نہ رہے۔ نیز انھیں کہیں کہ ضرورت سے زائد غلہ بیوپاریوں کے ہاتھ مقرر نرخوں پر فروخت کر دیں تاکہ بیوپاریوں کے لیے غلہ منڈی میں پہنچانے کا عذر باقی نہ رہے اور غلہ متواتر منڈیوں میں پہنچتا رہے۔

۷۔ سلطان علاء الدین منڈی کے مسائل میں بہت دلچسپی لیتا تھا۔ منڈی کے نرخوں کی استقامت کی خبریں تین ذرائع سے حاصل ہوتی تھیں۔

ا۔ کوتوال، منڈی کے نرخوں اور دیگر کاروبار کے متعلق بادشاہ کی خدمت میں اطلاع بہم پہنچاتا تھا۔

ب۔ منڈی کا گماشتہ اپنے طور پر منڈی کے کوائف بھیجتا تھا۔

ج۔ خفیہ اطلاعات بہم پہنچانے والے کارکن بھی منڈیوں کے حالات سے بادشاہ کو باخبر رکھتے تھے۔

۸۔ بلا ضرورت کسی کو غلہ خریدنے کی اجازت نہ ہو گی۔ اس سلسلے میں برنی لکھتا ہے:

گماشتگان[۵۲۳] منڈی ہا و شحنگان شہر و کوتوالان شہر فرمان دہند، تا اصلا و البتہ در دارالملک احتکار کردن ندہند و غلہ ہای محتکران رابسوزانند کہ پیغامبر اسلام غلہ محتکران راسوزانیدہ است و ہر کہ احتکار کند و احتکار را رسم و عادت گیرد و سد باب رزق بندگان خدا می شود و نعمت فراخی بر بندگان خدای تنگ گرداند و با مراو لوالامر از احتکار باز نیابند و احتکار راحرفت و پیشہ سازد اورا بمال و جلا تعزیر کنند و عبرت و انتباہ دیگراں سازند۔

منڈی کے گماشتوں، شحنوں اور کوتوالوں کے نام فرمان جاری کریں کہ دارالحکومت میں کسی کو ذخیرہ اندوزی نہ کرنے دیں اگر کوئی ایسا کرے تو اس کا غلہ نذر آتش کر دیا جائے کہ رسول اکرمؐ نے ذخیرہ اندوزوں کے غلے کو جلانے کا حکم صادر فرمایا تھا۔ جو بھی ذخیرہ اندوزی کرے، اور ذخیرہ اندوزی کو شعار بنائے، بندگانِ خدا کا رزق روکے، اللہ تعالیٰ کی نعمت فراواں کو لوگوں پر تنگ کر دے، حکم کے باوجود ذخیرہ اندوزی سے باز نہ آئے بلکہ اسے پیشہ ہی بنا لے تو اس کا ذخیرہ ضبط کریں یا شہر بدر کر دیں تاکہ دوسروں کے لیے عبرت ہو۔

متذکرہ بالا ضابطوں کا مؤثر نفوذ علاء الدین خلجی کے زمانے کا ایک عظیم کارنامہ ہے۔ اس کے عہد میں اجناس کے نرخ استوار رہنے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ سلطان کی نظر منڈی کے حالات پر رہتی تھی۔ اسے جہاں منڈی کے کوتوال اور گماشتے کے ذریعے سے اطلاعات پہنچتی تھیں، وہاں خفیہ خبریں پہنچانے والے، جو ہر منڈی میں متعین تھے، صورت حال سے دربار کو مطلع کرتے رہتے تھے اگر ان کی رودادوں میں کوئی فرق ہوتا تو کوتوال کو قرار واقعی سزا ملتی تھی۔

غلے کے علاوہ کپڑا، شکر، مصری، میوہ، گھی، تیل وغیرہ کی خرید و فروخت کے لیے بھی ضابطے مقرر تھے۔ جن کی وجہ سے ان اشیا کے نرخ نہیں بڑھ سکتے تھے۔ ان ضابطوں کے مطابق مندرجہ ذیل اقدامات کیے گئے تھے:

۱۔ خرید و فروخت کے لیے "سرائے عدل" (منڈی) کا قیام۔

۲۔ حکومت کی طرف سے نرخوں کا تعین۔

۳۔ ہندو اور مسلمان تاجروں کو حکم تھا کہ اپنے نام دفتر تجارت میں درج کرائیں۔

۴۔ تاجروں کی مالی امداد۔

کپڑے اور دوسری اشیا کے تاجر اور صنعت کار معاشرتی بہبود میں جو اہم کردار ادا کر سکتے ہیں، واضح ہیں، اس لیے صنعتی پیداوار بڑھانے اور اس کی قیمتیں کم کرنے کے لیے ملتان کے تاجروں اور صنعت کاروں کو حکومت کی طرف سے مالی امداد ملتی تھی۔ انھیں یہ مالی امداد اس لیے بھی ملتی تھی کہ کپڑے بیرونی ممالک سے درآمد کریں اور سرائے عدل میں سلطانی نرخ کے مطابق فروخت کریں۔ اس امداد کی رقم بیس لاکھ تنکہ تھی۔ ان تاجروں کو سرائے عدل کے انتظامی معاملات میں نمایندگی کا حق بھی دیا گیا تھا۔

پرمٹ کا رواج۔ سلطان کا فرمان تھا کہ قیمتی کپڑا از زربفت، زرنگار، ریشم، تبریزی کمخواب، حریر، چینی ریشم، جس کا تعلق عوام الناس سے نہ تھا، اس وقت تک کسی کو نہ دیا جائے، جب تک سرائے عدل کا رئیس اس کو پروانہ (پرمٹ) نہ دے اور وہ خود بھی دکانداروں کو اجازت نامہ نہ بھیجے۔ رئیس ایسے اجازت نامے امرا، ملوک، اکابر و معارف کو ان کے مراتب کے اعتبار سے دیتا تھا۔ ایسے تاجروں کو یہ کپڑا نہیں مل سکتا تھا جو اسے سلطانی نرخ پر خرید کر مہنگے داموں فروخت

ان اشیائے ضروریہ کے علاوہ مویشیوں، غلاموں اور روزمرہ کی چھوٹی بڑی چیزوں کی خرید و فروخت کے لیے بھی ضابطے مقرر تھے، جن سے کوئی سرتابی نہیں کر سکتا تھا۔

احکامِ شریعت اور آئینِ سلطانی

برنی سلطان محمود کے حوالے سے لکھتا ہے کہ اسلام کا منشا احکام شریعت کی پیروی کرنا ہے۔ جو حکمران زندگی اور ضروریاتِ زندگی میں شریعت رسول اکرمؐ سے رہنمائی حاصل کرے گا، وہ اسلام کی سعادت و برکت سے بہرہ یاب ہوگا اور اس کی حکومت، اسلامی حکومت ہوگی۔ اس کے برعکس بادشاہت کے لیے ضروری ہے کہ حکمران، خسرو اور ایران کے دوسرے عظیم بادشاہوں کی لادینی حکمت عملیوں کو بروئے کار لائے۔ جو حکمران ان کی متشددانہ حکمت عملی کو اپنائے گا اس کی بادشاہت قائم رہے گی، لوگ اطاعت گزار ہوں گے اور اس کے احکام سے کسی کو انحراف کرنے کی مجال نہ ہوگی۔

ظاہر ہے کہ شریعت رسول اللہؐ اور ایرانی بادشاہوں کی حکمت عملی میں بہت تضاد پایا جاتا ہے۔ خلفائے راشدین کے زمانے میں جب ایران و شام فتح ہوئے اور ان کے ہاتھوں میں وسیع و عریض مملکت کا اختیار آیا تو انھوں نے عوام کے معاملات طے کرنے میں رسول اللہ کے مسلکِ حیات سے سرمُو انحراف نہ کیا، یہاں تک کہ زندگیوں کو خطرے میں ڈالنے سے بھی دریغ نہ کیا اور ایرانی روایات اور حکمت عملیوں سے احتراز کیا۔ یہ آنحضرتؐ کا معجزہ ہے کہ خلفائے راشدین نے حکومت کے ساتھ ساتھ مسلکِ درویشی کو بھی قائم رکھا۔ انھوں نے موٹا جھوٹا لباس پہن کر اور سادہ غذا کھا کر بھی وسیع حکومت کے کاروبار کامیابی سے چلائے۔

ان کے بعد آنے والے خلفا اور شاہانِ اسلام کو وقت کے نئے تقاضوں کی وجہ سے دو متضاد صورتوں سے سابقہ پڑا۔ برنی لکھتا ہے کہ اگر وہ خالصتہً اسلامی روایات پر عمل پیرا ہوتے تو ممکن نہ تھا کہ حکومت کے امور کامیابی کے ساتھ چلا سکتے۔ اس کے برعکس اگر وہ قدیم ایرانی بادشاہوں کی پیروی میں متشددانہ مسلک اختیار کرتے تو اسلامی روایات کی خلاف ورزی ہوتی۔ دونوں مسلکوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت اسلامی پر عمل کرنے سے دین عروج کو پہنچا اور بادشاہوں

کے زمانے میں بادشاہت نے دنیاوی خوش بختی کی انتہا کو پایا۔ یہ دونوں عروج ایک دوسرے کی ضد ہیں اور ان کا یک جا ہونا ممکن نہیں۔

برنی یہ بھی لکھتا ہے کہ بندگی کی مذہب کی ضروری شرط ہے۔ اور عجز و انکسار، درویشی، ایثار اور رقت قلب بندگی کے ضروری شرائط ہیں۔ دوسری طرف طاقت، کبر، وحدت اختیار، شاہانہ جاہ و جلال، ذاتی وقار، دوسروں سے بے تعلقی بادشاہت کا لازمہ ہیں اس لیے بادشاہت کا قیام بندگی کی صفات کی پیروی کرتے ہوئے ممکن نہیں۔ اس لیے شاہان اسلام کے لیے بھی ضروری ہوگیا کہ لادینی امور کو طے کرنے اور دشمنوں کا قلع قمع کرنے اور اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے کے لیے ایرانی بادشاہوں کی حکمت عملی پر عمل کریں۔ لیکن احکام خداوندی کی عظمت اور دین اسلام کی برتری قائم کرنے کا مقصد بھی ان کے پیش نظر رہنا چاہیے۔ قدیم بادشاہوں نے جو لادینی مسلک اختیار کیے، اسلام تو ان کی اجازت نہیں دیتا، بہرحال اس سلسلے میں برنی نے جو کچھ کہا ہے، اس کا ملخص درج ذیل ہے:

جس طرح انتہائی ضرورت کے وقت ممنوع چیزوں کے کھانے کی بھی اجازت ہے، اسی طرح وقت کے نئے تقاضوں کے پیش نظر لادینی حکمت عملیوں کو قبول کر لینے کے سوا بھی چارہ نہیں۔ اب یہ مسلمان بادشاہوں کا فرض ہے کہ ان حکمت عملیوں پر عمل کرتے ہوئے خدا سے ڈرتے، اور بارگاہ ایزدی میں اپنی کوتاہیوں کی معذرت پیش کرتے رہیں۔ نیز وہ توحید کی اشاعت اور شریعت کی پابندی کے فرائض نہ بھولیں۔

(باقی آئندہ)

حواسلے:

۱ـ مخطوطہ فتاوائے جہانداری، ورق ۲ ب	۲ـ ایضاً ورق ۶ ب
۳ـ ایضاً	۴ـ ایضاً ورق ۱۷ ا
۵ـ ایضاً ورق ۲۱ ب و ۲۲ ا	۶ـ ایضاً ورق ۲۳ ا، ۲۳ ب
۷ـ ایضاً ورق ۲۴ ا، ۲۴ ب	

۵۸ تاریخ فیروز شاہی، مصحح پروفیسر شیخ عبدالرشید: جلد دوم، ص ۱۲۳

۵۹ ایضاً، ص ۱۲۴
۶۰ ایضاً

۶۱ مخطوطہ، ورق ۳۳ ا
۶۲ ایضاً ورق ۳۴ ا

۶۳ ایضاً، ورق ۳۷ ا
۶۴ ایضاً، ورق ۴۴ ا

۶۵ ایضاً
۶۶ ایضاً، ورق ۱۳۶ ب، ۱۳۷ ا

۶۷ ایضاً، ورق ۶۵ ب
۶۸ ایضاً

۶۹ بحوالہ انشائی ماہرو: طبع ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان، ص ۷۰

۷۰ مخطوطہ: ورق ۹۱ ا
۷۱ خیر المجالس کے۔ اے نظامی، ص ۲۴۱

۷۲ تاریخ فیروز شاہی: مصحح پروفیسر شیخ عبدالرشید، جلد دوم، ص ۱۳۶

۷۳ مخطوطہ: ورق ۹۲ ا

اسلام اور چند معاشی مسائل

سید یعقوب شاہ

اس کتاب کے مصنف مالیات کے بھی ماہر ہیں اور دینی علوم سے بھی شغف رکھتے ہیں۔ اپنی اس تصنیف میں انھوں نے ربوا، زکوٰۃ اور بیمہ جیسے زندہ اور اہم معاشی مسائل پر اظہار خیال کیا ہے اور کتاب وسنت، تاریخ، عمرانیات اور اقتصادیات کا غائر مطالعہ کرنے کے بعد اپنے نتائج شگفتہ اور سلیس انداز میں قلم بند کیے ہیں۔

قیمت عام ایڈیشن ۵ روپے عمدہ ایڈیشن ۶.۵۰ روپے

ملنے کا پتہ

سیکریٹری ادارۂ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور